تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

(۳)

نکتۂ ششم اب مجھے قرارداد کے چھٹے نکتے کی تشریح کرتے ہوئے آپ کو یہ بتانا ہے کہ تقسیم کے موقع پر اور اس کے فوراً بعد حالات میں کتنا عظیم اور بڑی حد تک غیر متوقع تغیر واقع ہو گیا، ان بدلے ہوئے حالات کے تقاضے قبل تقسیم کے حالات سے کس قدر مختلف تھے، اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے ان کے موافق اور مخالف پہلو کیا تھے، ان میں کام کرنے کے لیے کیا نئے مواقع ہمارے سامنے آئے اور کیا نئے ذرائع ہیں ہم پہنچے، تقسیم سے پہلے ہمارے لیے آئینی ذرائع سے نظام حکومت کو بدلنے اور قیادت میں انقلاب لانے کے جو دروازے شرعی موانع کی وجہ سے بالکل بند تھے انہیں کھولنے کے کیا نئے امکانات پیدا ہو گئے، اور اس پوری صورت حال کا بروقت اور بالکل ٹھیک اندازہ کر کے ہم نے اپنے سابق طریق کار میں جو تغیر کیا اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور وہ کیوں نہ صرف صحیح اور نہ صرف ناگزیر تھا بلکہ اگر ہم ان حالات میں قبل تقسیم کے طریقے ہی پر کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیتے۔

حالات کا تغیر اور اس کے تقاضے جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں، پاکستان بننے سے پہلے ہم جن حالات میں کام کر رہے تھے وہ یہ تھے کہ ملک پر بیرونی کفار کی حکومت پوری طاقت کے ساتھ قائم تھی، ملک میں وطنی قومیت کی بنیاد پر لادینی جمہوریت کا نظام مستقل بنیادوں پر جما ہوا تھا، ملک کی آبادی کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ غیر مسلموں پر مشتمل تھا اور اسلام کے ماننے والے ایک چوتھائی سے بھی کم تھے، غیر مسلم اکثریت ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک میں جذب ہو چکی تھی اور اس مبدء سے لبریز

تھی کہ عنقریب وہی انگریزی اقتدار کی وارث ہوگی، مسلم اقلیت ایک جوابی قوم پرستانہ تحریک میں مستغرق تھی جس کا اوّلین ہدف یہ تھا کہ ملک تقسیم ہو اور اس کے مسلم اکثریت والے علاقے میں کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی ایک قومی ریاست قائم ہو جائے، اور اسلامی انقلاب کے لیے ہماری اصولی تحریک عملاً اُس وقت شروع ہوئی تھی جب کہ یہ دونوں قوم پرستانہ تحریکیں نہ صرف یہ کہ پورے میدان پر قابض ہو چکی تھیں بلکہ ایک سخت معرکے میں ایک دوسرے سے گتھ بھی چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہمارے لیے اُس کے سوا کوئی اور طریق کار ممکن ہی نہ تھا جس پر ہم اس زمانے میں کام کر رہے تھے۔

پاکستان کی ابتدائی سکیم جس پر اُس زمانے میں کام کیا جا رہا تھا، اُس کا یہ نقشہ تھا کہ اُس میں مسلم اکثریت کے علاقے تو ضرور شامل تھے لیکن غیر مسلم اقلیت قریب قریب ۴۰ فیصدی تھی اور اس بھاری اقلیت کے ساتھ خود مسلمانوں کے فرنگیت زدہ گروہ اور مادی مفاد کے پرستار طبقوں سے بھی یہ عین متوقع تھا کہ وہ اسلام کی راہ روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اس لیے مشکل ہی سے اُس وقت یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ تقسیم ملک واقع ہونے کی صورت میں اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے ہندوستان اور پاکستان کے حالات ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف ہوں گے، اور ہم پاکستان میں اُس طریق کار سے آگے کوئی قدم بڑھا سکیں گے جو انگریزی دَور کے متحدہ ہندوستان میں ہمارا تھا۔

لیکن جب تقسیم واقع ہوئی تو حالات میں پے در پے ایسے تغیرات رونما ہوئے جن میں سے بعض تو اس سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے، اور انہوں نے دیکھتے دیکھتے سارا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

صوبوں کی تقسیم اور تبادلۂ آبادی | اوّلین تغیر یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال اور آسام کی تقسیم عمل میں آئی جس کی وجہ سے پاکستان اپنی ابتدائی اسکیم کی بہ نسبت بہت بڑی مسلم اکثریت پر مشتمل ہو گیا۔ اس کے بعد عین تقسیم کے موقع پر اس سے بھی بڑا اور دُور رس تغیر یہ رونما ہوا کہ دفعتہً جبری تبادلۂ آبادی عمل میں آگیا جس نے مغربی پاکستان کو ۹۸ فیصدی اور مشرقی پاکستان کو تقریباً ۸۰ فی صدی مسلم آبادی کا علاقہ بنا دیا۔ اس طرح پاکستان کے نظام زندگی کی شکل کا تعین بالکل مسلمانوں کی رائے عام پر منحصر ہو گیا، دراں حالیکہ متحدہ ہندوستان میں وہ غیر مسلموں کی رائے پر منحصر تھا۔ اس فرقِ عظیم کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ اسلامی نظامِ زندگی

کے لیے غالب مسلم آبادی کے ملک میں کام کرنے کا ڈھنگ غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں کام کرنے کے ڈھنگ سے مختلف ہو۔ اگرچہ مسلمانوں کی اعتقادی اور اخلاقی کمزوریوں کو نظرانداز کر کے محض مسلمان ہونے کے مفروضے پر ایک عمارت کھڑی کر دینا بڑی حماقت ہے لیکن اس سے کچھ کم درجے کی حماقت یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کے لیے ان کی عقیدت اور اس کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی اور اس کی طرف ان کے فطری میلان و رجحان کو نظرانداز کر کے آدمی ان کے درمیان اس طرح کام کرنے لگے جس طرح کسی منکرِ اسلام یا مخالفِ اسلام آبادی میں کیا جاتا ہے۔ کسی ملک میں ایک غالب مسلم آبادی کی موجودگی اسلامی نظام کے حق میں رائے عام تیار کرنے کے جو مواقع بہم پہنچاتی ہے ان سے فائدہ نہ اٹھانا اور نظامِ کار کی تبدیلی کے لیے جد و جہد کے جو راستے اس میں کھل سکتے ہیں انہیں بند سمجھ لینا کسی صاحبِ عقل آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم فائدہ جو اس چیز سے اٹھایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جس دوران میں معاشرے کو ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے نظامِ حق اور امامتِ صالحہ کے لیے تیار کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہوں، عوامی جذبات کو ان کوششوں کی پشت پناہ بنائے رکھا جائے تاکہ قیادتِ فاسقہ انہیں روکنے اور برباد کرنے کے لیے کوئی طوفان نہ اٹھا سکے اور نظامِ باطل کی جڑیں جمنے نہ پائیں۔ لیکن اگر عقل سے کام لیا جائے تو اس کا یہ فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ تعمیری مساعی اور عوامی تحریک، دونوں متوازی چلتی رہیں تاکہ عوامی تائید جتنی بڑھتی جائے اسی رفتار سے نظامِ باطل کو پیچھے ہٹانے اور نظامِ حق کو آگے بڑھانے کا تدریجی عمل جاری رکھا جا سکے اور بالآخر یہ دونوں قسم کی کوششیں ایک نتیجہ پر تمام ہوں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی مقام پر آپ ایک مسجد بنا رہے ہیں اور آپ کے پیشِ نظر یہ ہے کہ اس مسجد ہی کو پورے علاقے کا مرکز بنانا ہے، لیکن ایک سیلاب کا خطرہ ہر وقت آپ کے سر پر منڈلا رہا ہے جو اس تعمیر کو کسی وقت بھی آ کر روک سکتا ہے بلکہ تباہ و برباد بھی کر سکتا ہے۔ اب اگر آپ کے گرد و پیش کوئی مسلم آبادی ایسی موجود ہے جو چاہے نماز نہ پڑھتی ہو، مگر مسجد کا احترام کرتی ہو اور تعمیرِ مسجد کے مقصد سے ہمدردی رکھتی ہو تو آپ اس سے اتنا فائدہ تو اٹھا ہی سکتے ہیں کہ تھوڑا سا جذباتی اپیل کر کے اُسے سیلاب کے آگے بند باندھنے پر آمادہ کر لیں۔ لیکن یہی اپیل اگر حکمت و دانش کے ساتھ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تعمیرِ مسجد کی حفاظت کا جذبہ پیدا کرتے کرتے آپ اسی آبادی میں

سے وہ لوگ بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں نہ نکلتے جائیں جو نماز بھی پڑھنے لگیں اور اس تعمیر کے کام میں معمار اور کاریگر بننے کے لیے بھی تیار ہو جائیں ۔ اگر آپ کے پیش نظر یہی مقصد ہے کہ اس مسجد کو آخر کار پورے علاقے کا مرکز بنانا ہے تو تعمیر مسجد کی کوشش کے ساتھ ساتھ عوامی اپیل جاری رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس روز مسجد کی تعمیر مکمل ہوگی اسی روز وہ علاقے کا مرکز بھی بنی ہوئی ہوگی ۔ اس کے بجائے یہ تجویز غالباً معقول نہ ہوگی کہ پہلے آپ چند سال تعمیر مسجد میں صرف کریں پھر اسے علاقے کا مرکز بنانے کے لیے نکلیں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران میں سیلاب آپ کو تعمیر کرنے ہی نہ دے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس درمیانی مدت میں گرد و پیش کی آبادی کسی گرجا یا کسی مندر کی عقیدت میں گرفتار ہو چکی ہو ۔

سابق لادینی دستور کا عارضی قرار پانا

دوسرا بنیادی تغیر یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے جس قانون (INDIAN INDEPENDENCE ACT) نے ہندوستان و پاکستان کی طرف آزادی کے اختیارات منتقل کیے تھے اس کی رو سے انگریزی دورِ حکومت کا لادینی دستور آپ سے آپ عارضی قرار پا گیا اور ملک کے لیے ایک نئے دستور کا سوال پیدا ہو گیا ۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ملک کا نیا دستور وطنی قومیت اور لادینی جمہوریت کے اصولوں پر نہ بننے دیا جائے اور اسلامی اصولوں پر اس کی تاسیس کرانے کے لیے بلا تاخیر کام شروع کر دیا جائے ۔ ایسا کرنا نہ صرف اس غرض کے لئے ضروری تھا کہ وہ شرعی موانع دور ہو جائیں جو انقلابِ قیادت کے لیے آئینی طریقہ اختیار کرنے کی راہ میں ایک لادینی جمہوریت کا دستور حائل کر دیتا ہے ۔ بلکہ یہ اس لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ غیر مسلموں کی لادینی قومی ریاست کی بہ نسبت مسلمانوں کی قومی لادینی ریاست اسلام کی راہ میں جتنی بڑی اور خطرناک رکاوٹ بنتی ہے اس سے ہم خوب واقف تھے[۱] علاوہ بریں یہ کوئی عقلمندی نہ ہو سکتی تھی کہ جس وقت ایک نوخیز مملکت

---

[۱] اس کی تفصیل "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں پہلے ہی بیان کی جا چکی تھی ۔ اور جب ۱۹۴۸ء میں اسلامی دستور کا مطالبہ اٹھایا گیا اس وقت بھی معاملے کے اس پہلو کی بار بار صراحت کی گئی ۔ ملاحظہ ہو "مطالبۂ نظامِ اسلامی" صفحہ ۲۱ "آزادی کے اسلامی تقاضے" صفحہ ۲۲-۲۷

کے لیے نئے دستور کی تدوین، اور حقیقۃً "مستقبل کے نظامِ زندگی کی تلاش کا سوال درپیش ہو، اس وقت تو ہم لادینی دستور کی مخالفت اور کافرانہ نظام کی مزاحمت اور اسلامی اصولوں پر نئی عمارت کی تعمیر کے لیے کوئی مؤثر جدوجہد نہ کریں، اور جب لادینی نظام از سرِ نو یہاں خوب جڑ پکڑ لے اور نشوونما کا راستہ پا کر پوری تیزی کے ساتھ معاشرے کو فکر و عمل کے لحاظ سے کفر و فسق کے سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دے تو ہم اس کو بدلنے کی دعوت لے کر اٹھیں۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اگر فی الواقع ہمارے پیشِ نظر یہی مقصد ہے کہ یہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہو، تو اس کے لیے اولین ضرورت بہرحال یہ ہو گی کہ ہم یہاں کے زیادہ سے زیادہ باشندوں کو اسلامی ریاست کے نظریے سے واقف اور اس کا قائل، اور اس کا طالب بنانے کی کوشش کریں۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ہماری ایک اکیڈمی ہو جو اسلامی ریاست کے موضوع اور اس سے متعلق مسائل پر بہترین علمی کتابیں شائع کرے اور ہم سالہا سال کی کوششوں سے علومِ سیاست و اجتماع میں اپنے نظریے کا سکہ جما دیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جس وقت ہمارے ملک میں یہ سوال فیصلہ طلب ہو کہ ریاست کا نیا نظام کن بنیادوں پر تعمیر کیا جائے، اس وقت ہم میدان میں آ کر عوام اور خواص سب کے سامنے اپنا نظریہ پیش کریں اور ہر ایک کو اس کی استعداد کے مطابق اسلامی ریاست کا محض تصور ہی نہ دیں بلکہ اسے اس کا قائل اور حامی اور طالب بنانے کی بھی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان جو شخص بھی موازنہ کر کے دیکھے گا اس کے لیے یہ ماننے کے سوا چارہ نہ ہو گا کہ ہمارے مقصد کے لیے دوسرا طریقہ زیادہ کارگر ہے۔ آپ ہزار کتابیں لکھ کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ جس وقت کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے سامنے درپیش ہو اس وقت میدان میں آ کر اس مسئلے میں ان کو صحیح رہنمائی دیں۔ ایسے مواقع پر چند جملے بڑی بڑی کتابوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور ذہنوں میں اچھی طرح جذب ہو جاتے ہیں۔

قومی زندگی کا خلا

تیسرا بڑا تغیر یہ تھا کہ مسلم قوم پرستی کی وہ تحریک جو تقسیم سے پہلے مسلمانوں کے ذہن پر غلبہ پائے ہوتے تھی، اپنی منزلِ مقصود ـــــ پاکستان کو پہنچ کر یکلخت ٹھنڈی پڑ گئی اور وہ کوئی ایسا ایجابی نظام اور پروگرام نہ لا سکی جو مسلم عوام کو تقسیم کے بعد بھی اس کے ساتھ وابستہ رکھتا۔ مزید برآں اس تحریک کی علمبردار جماعت نے تقسیم کے وقت اور اس کے بعد جس کردار کا مظاہرہ کیا اس نے چند مہینوں کے

اندر اس کے وقار اور اخلاقی اثر کے فلک بوس قصر کو زمین بوس کر دیا۔

اُس وقت کوئی دوسری منظم تحریک ایسی موجود نہ تھی جو اس خالی میدان پر قبضہ کر سکتی۔ اس خلا نے یہ موقع خود بخود پیدا کر دیا کہ ایک ایسی اصولی تحریک آگے بڑھ کر عوام کے ذہن پر اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کرے جس کی تائید کے لیے مسلمانوں کے مذہبی عقائد، دینی جذبات، صدیوں کی روایات اور سلف سے خلف تک کا پیدا کیا ہوا بے شمار لٹریچر موجود تھا اور جو خود بھی تقسیم سے پہلے اپنے خیالات وسیع پیمانے پر پھیلا چکی تھی۔ ہم سخت نادان ہوتے اگر اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیتے اور اپنے آپ کو قبل تقسیم ہی کی پوزیشن میں سمجھے بیٹھے رہتے۔

اُس وقت عوام کے جذبات ہر رُخ پر مڑ سکتے تھے اور موڑے جا سکتے تھے۔ اسلامی نظام کے مطالبے کی طرف ان کے مڑنے کے سب سے زیادہ امکانات تھے، کیونکہ وہ مذہباً اسلام کے معتقد تھے اور انہوں نے نیک نیتی کے ساتھ پاکستان کے قیام کی جدوجہد اسی لیے کی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو۔ لیکن اگر اس رُخ پر انہیں موڑنے کی کوشش نہ کی جاتی تو وہ انارکی کی طرف بھی مڑ سکتے تھے۔ پاکستان کے نئے حکمرانوں کی زیادتیوں نے اس کے لیے اچھے خاصے امکانات پیدا کر دیئے تھے۔ وُہ اشتراکیت کی طرف بھی مڑ سکتے تھے۔ مہاجرین کی حالتِ زار، عام معاشی بدحالی، نظم و نسق کی خرابی اور ظالم طبقوں کی لوٹ کھسوٹ نے وہ خشک گھاس فراہم کر دی تھی جس میں یہ آگ خوب پھیل سکتی تھی، اور ہماری سرحد سے متصل رُوس کی موجودگی یہاں وہی حالات پیدا کر سکتی تھی جو روس کے دوسرے طفیلی ملکوں میں آج آپ دیکھ رہے ہیں۔ وُہ قوم پرستی کی طرف بھی مڑ سکتے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے تازہ مظالم کی یاد نے، ہندوستان اور پاکستان کی کشمکش نے، اور سب سے بڑھ کر کشمیر کے معاملے نے اس کے لیے میدان تیار کر رکھا تھا اور اگر اس چیز کو جڑ پکڑنے کا موقع مل جاتا تو یہاں ہر وہ شخص قومی غدار اور عوام کا دشمن (PEOPLE'S ENEMY) قرار پا سکتا تھا جو لادینی قومی حکومت کی مرضی کے خلاف دینی نظام کے لیے آواز اُٹھاتا۔ خود ہمارے مطالبۂ نظامِ اسلامی کو شکست دینے کے لیے مسئلہ کشمیر کے متعلق عوام کے جذباتی اشتعال کا رُخ ہماری طرف موڑنے کی جو کوشش ۱۹۴۸ء میں کی گئی تھی وہ

اتنی پرانی تاریخ کی بات نہیں ہے کہ آپ اُسے بھول گئے ہوں۔ اس سے آپ یہ سبق لے سکتے ہیں کہ اگر عوام کے جذبات کو اسلامی تحریک کی پشت پناہی کے لیے تیار کرنے میں ہم سے کچھ بھی تساہل ہو جاتا تو کچھ مدت کے بعد یہ سرزمین اس تحریک کے لیے کیسی شوریلی اور خارزار بن جانے والی تھی۔

اسلامی ریاست کے ناقص تصور کا ظہور اُس وقت عوام کے ذہن میں یہ بات تازہ تھی کہ سات آٹھ سال سے جس پاکستان کے لیے ہم لڑتے رہے ہیں اور جس کی تعمیر لاکھوں مسلمانوں کے خون اور ہزاروں عورتوں کی عصمت اور اربوں روپے کے اموال و املاک کی قربانی پر ہوئی ہے، وہ اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسے اسلامی ریاست بنانے ہی کا وعدہ ہم سے کیا گیا تھا۔ لیکن انہیں ٹھیک معلوم نہ تھا کہ اسلامی ریاست چیز کیا ہے اور کیا اس کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عوام تو درکنار اچھے خاصے نام ور علماء تک اسلامی ریاست کا بس یہ تصور رکھتے تھے کہ حکومت چاہے جیسی اور جس اصول پر بھی ہو، اس میں ایک شیخ الاسلام کا منصب قائم ہو جائے اور نکاح و طلاق کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے قضائے شرعی کا انتظام کر دیا جائے۔ ہمارے مذہبی طبقوں کی طرف سے جو مطالبات اس وقت پیش ہونے شروع ہو گئے تھے وہ محض شراب کی بندش، قحبہ خانوں کے سدِّباب، بیت المال کے قیام اور ایسے ہی چند جزئیات پر مشتمل تھے۔ اس اہم تاریخی موقع پر اسلامی حکومت کے مطالبے کا اُٹھنا تو ایک فطری امر تھا، حالات کا قدرتی تقاضا تھا، اور کسی نہ کسی طرف سے اس کو اُٹھنا ہی تھا، بلکہ وہ اُٹھنا شروع ہو بھی چکا تھا۔ لیکن اس وقت اگر مسلمانوں کا عام ذہن اسلامی حکومت کا مفہوم اور تصور وہی کچھ سمجھ لیتا جو مذہب کے نمائندوں کی طرف سے پیش کیا جا رہا تھا، اور اسی پر مسلمانوں کے سارے مطالبات مرکوز ہو جاتے تو ابد تک کسی وقت اس کے بنیادی نظریے اور جامع اور ہمہ گیر تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کرنا سخت مشکل ہو جاتا۔ اس نفسیاتی موقع کو ہاتھ سے کھو دینے کے بعد ہم مدت دراز تک اس قابل نہ ہو سکتے تھے کہ پاکستان کی آبادی کے عوام اور خواص کو وسیع پیمانے پر اسلامی حکومت کے صحیح معنی سے آشنا کر سکتے، اور اس کے محدود تصورات کو ان کے ذہن سے نکال کر اصل چیز کی طلب ان کے اندر پیدا کر سکتے۔

مسلم قوم کے افراد ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض اُس وقت ایک مسلمان قوم نئی نئی آزاد ہوئی تھی اور

اسے یہ اختیار ملا تھا کہ اپنے لیے ایک نظامِ زندگی کا خود انتخاب کرے اور اپنی حیاتِ قومی کے لیے مختلف ممکن راستوں میں سے کسی ایک راستے کو چن لے۔ تقسیم سے پہلے کافروں کی غلامی کے دور میں اور کافر آبادی کی اکثریت کے دباؤ میں رہتے ہوئے اگر وہ انفرادی ایمان کے ساتھ اجتماعی کفر کی راہ پر چل رہی تھی تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ عذر کا موقع تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد پوری طرح اپنی راہ کے انتخاب میں مختار ہو کر بھی اگر وہ اس راہ کو انتخاب کرتی یا اس پر راضی رہتی تو یہ اضطراری نہیں بلکہ اختیاری کفر ہوتا جس کے بعد انفرادی ایمان کی بھی خیر نہ تھی — یہ خدا کی طرف سے بڑی سخت اور نازک آزمائش کی گھڑی تھی۔ ہم اجنبی بھی ہوتے تو ہمارے ایمان کا یہ تقاضا تھا کہ آگے بڑھ کر اس مسلمان قوم کو اس آزمائش سے بخیریت نکالنے کی کوشش کریں۔ لیکن ہم تو اجنبی بھی نہ تھے۔ اسی قوم کے فرد، اور اس کی بھلائی اور برائی میں اس کے شریکِ حال تھے۔ ہم اگر اس فرض کو ادا کرنے کے لیے نہ اٹھتے تو کون سا دوسرا عمل ہمیں اس قصور پر خدا کی پکڑ سے بچانے والا ہو سکتا تھا؟ ہمارے مطالبۂ دستور کا عوام اور خواص کی بھاری اکثریت نے جس طرح ساتھ دیا، اور اسلامی حکومت کے محدود تصور کو چھوڑ کر اس کے بنیادی نظریے اور جامع تصور کو جتنی جلدی اور جس قدر وسیع پیمانے پر لوگوں نے قبول کیا، یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ قوم سیرت و اخلاق میں چاہے کتنی ہی کوتاہ ہو، اسلام پر اعتقاد رکھنے میں منافق نہیں ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ یہ قوم اس آزمائش کے موقع پر خود ایک صحیح رہنمائی کی طالب تھی۔ اس کے بعد تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا فرض عوام کو یہی رہنمائی دینا تھا۔ اس میں ہم کوتاہی برتتے تو سخت گنہگار ہوتے۔

نئی فاسق قیادت کا خطرہ اُس وقت پرانے ذی اقتدار گروہ (انگریز) کی جمی ہوئی طاقت اکھڑ چکی تھی، اور خود مسلمانوں میں ایک نیا ذی اقتدار طبقہ ابھر رہا تھا جس کی فرمانروائی ابھی جمی نہ تھی۔ یہ طبقہ اپنے رجحانات کے راستے پر ساری قوم اور مملکت کو لے جانا چاہتا تھا اور اس غرض کے لیے اس نے پاکستان بنتے ہی ایک طرف اسلام کے بارے میں سخت انتشارِ خیال پیدا کر دینے کی مہم شروع کر دی تھی اور دوسری طرف تمام اختیارات اور طاقتوں اور وسائل سے کام لے کر قوم کو اس اخلاقی بگاڑ کی راہ پر دھکیلنا شروع کر دیا

تھا جس میں غرق ہو جانے کے بعد اس کے اندر اسلام کی طرف پلٹنے کی شکل ہی سے کوئی سکت باقی رہ سکتی تھی۔ اس حالت کا تقاضا یہ تھا کہ ابتدائی مرحلے ہی میں اس طبقے کی مزاحمت کے لیے ایک عوامی تحریک اُٹھ کھڑی ہو جو فکری انتشار و پراگندگی کی اس مہم کا مداوا بھی کرے، اور اس کے ساتھ اس فاسق و فاجر قیادت کا نفوذ و اثر بھی کسی مضبوط بنیاد پر نہ جمنے دے۔ آج آپ پاکستان میں ان دونوں بیماریوں کو جس حال میں پا رہے ہیں وہ اُن کوششوں کے باوجود ہے جو پچھلے دس سال میں ان کے مقابلے کے لیے کی گئی ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ اگر یہ کوششیں نہ ہوتیں اور قبل تقسیم ہی کا طریق کار ٹھنڈا ٹھنڈا اختیار رہتا تو ذہنی پراگندگی کہاں تک پہنچتی اور فسق کیسی کچھ محفوظ اور تسلیم شدہ پوزیشن حاصل کر چکا ہوتا۔

برعظیم ہند میں اسلام کے مستقبل کا مسئلہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس وقت برعظیم ہند میں اسلام کی ہزار سالہ تاریخ ایک فیصلہ کن لمحے سے دوچار تھی۔ صدیوں تک ہمارے اسلاف کرام نے اس سرزمین میں خدا کا کلمہ پھیلانے کی جو کوششیں کی تھیں ان کا سارا ماحصل اس نتیجے پر ختم ہوتا نظر آرہا تھا کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں، جسے ہم خود پاکستان کی قیمت کے طور پر دے چکے تھے، اسلام دوسروں کے مٹائے مٹے اور دو چھوٹے حصوں میں جنہیں ہم نے بھاری قیمت پر حاصل کیا تھا، وہ ہمارے اپنے فاسقین و فجار کے ہاتھوں مٹ جائے۔ اندلس کے بعد یہ دوسرا اور اس سے عظیم تر المیہ تھا جو ۱۹۴۷ء میں ہمارے سامنے شروع ہو رہا تھا، اور وقت کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ اس کو روکنے کے لیے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے کیا جائے۔ میرے تاثرات اُس وقت جو کچھ تھے ان کو میں نے اپنی اُن تقریروں میں بار بار بیان کیا تھا جو مطالبۂ نظامِ اسلامی کے موضوع پر میں نے ۱۹۴۸ء کے آغاز میں مغربی پاکستان کے تمام مرکزی مقامات پر کی تھیں۔

> "ہمارے اسلاف نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی لگاتار کوششوں سے پھیلایا تھا وہ اب آٹھ سو سال کے بعد پاکستان کے دو خطوں میں سکڑ کر رہ گیا ہے۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اُٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا۔ اس برعظیم کے تین چوتھائی حصے سے تو اسلام دوسروں کے مٹائے مٹ رہا ہے۔ یہاں یہ ہمارے اپنے مٹائے مٹے گا۔ اس لیے

اب ہمیں اگلا قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے ۔ اب صرف ایک ٹھوکر ہی ہمارے اور اسلام کے مٹنے میں حائل ہے ۔ اگر ہم نے اس موقع پر ٹھوکر کھائی تو ہمارے اسلاف کے دینی کارناموں کی ساری تاریخ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی "۔[۵]

اور یہ ٹھوکر کھا جانے کا اندیشہ، جسے میں نے اس وقت بیان کیا تھا، محض ایک خیالی اندیشہ نہ تھا، بلکہ وہ آثار علانیہ نظر آ رہے تھے جن کی بنا پر حقیقت میں یہ صحیح اور قوی اندیشہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کی گئی تو یہ قوم یہ آخری ٹھوکر بھی کھا جائے گی ۔ میں نے "جماعتِ اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل" میں تفصیل کے ساتھ ان آثار کی نشان دہی کی ہے اور اس بحث کو ان فقروں پر ختم کیا ہے جن سے اُس وقت کی صورتِ حال آپ کے سامنے آ سکتی ہے :

"جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اُسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بُری یا بھلی تعمیری سعی بھی آج تک ہم کر سکے ہیں، اب اسی پر اکتفا کرنا ہو گا اور اُس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یکایک با اختیار ہو گئی ہے۔ اس فوری اقدام کی ضرورت کا احساس اُن حالات کو دیکھ کر اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جو عین تقسیم کے وقت اور اس کے مابعد پیش آئے ۔ ہندوستان کے بعض حصّوں سے مسلمانوں کا خروج جس شان سے ہوا، پاکستان سے غیر مسلموں کی نکاسی جس طرح عمل میں آئی، غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی دولت کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا، اور مسلمان مہاجرین پاکستان میں جن حالات سے دوچار ہوئے، یہ سب کچھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں پوری قوم کی، اس کے عوام اور خواص کی، اس کے لیڈروں اور پیشواؤں کی، اس کے حکام اور عمّال کی، اس کے اہلِ دین اور اہلِ دنیا کی، غرض سب ہی کی اخلاقی اور اجتماعی تصویر بالکل برہنہ نظر آ گئی ۔ پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو

---

[۵] ۔ مطالبۂ نظامِ اسلامی ۔ صفحہ ۶

اُب قائد ہی نہیں، حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی اُلجھی اور متضاد باتیں کرنی شروع کیں، اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکرے گروہ کے ہاتھ میں ہیں، یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس مملکت کی بنیاد بنا بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے" (صفحہ ۶۱، ۶۲)

جماعت اسلامی کی پوزیشن | یہ تھے وہ حالات، اور اُن کے تقاضے اور موافق و مخالف امکانات جن سے ہمیں تقسیم کے بعد سابقہ پیش آیا۔ جماعت اسلامی کو اس وقت کام کرتے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے ہمارے سامنے کام کا جو نقشہ تھا اس کے لحاظ سے ہم کسی عوامی تحریک کے آغاز سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ ہمارے پاس ایسے کارکنوں کا ایک گروہ موجود ہو جو نظم و ضبط کے اعتبار سے خوب پختہ اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے پوری طرح قابل اعتماد ہوں، ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر میدان میں مخالف نظریات و افکار کو شکست دینے اور ایک نیا نظام تعمیر کرنے کے لائق ہوں اور ان میں قیادت کی صلاحیتیں بھی اس حد تک پائی جاتی ہوں کہ ان میں کا ایک ایک آدمی ایک ایک علاقے کا لیڈر بن سکے اور عوام کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ اُبھار سکے اور منظم طریقے سے ساتھ لے کر چل سکے۔ ان اعتبارات سے ہم ابھی اپنے اندر بہت کچھ کمی محسوس کرتے تھے اور اپنی جماعت کو تیار کرنے کے لئے مزید وقت کے طالب تھے۔ لیکن ہمارے سامنے اس وقت اصل سوال یہ نہیں تھا کہ ہم اس کمی کو پورا کریں یا نہ کریں، بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ آیا ہم جماعتی حیثیت سے اس وقت حالات کے اس چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہیں یا نہیں؟ دوسرے الفاظ میں اُس وقت ہمارے سامنے معاملے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ کام کے جو مواقع اور راہ کی رکاوٹیں دُور کرنے کے جو امکانات اور مخالف حالات کی وجہ سے جو خطرات ہمارے لیے آج پیدا ہوئے ہیں وہ سب اس انتظار میں ٹھیرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہم اپنی تیاریوں کی تکمیل کر کے میدان میں آئیں، بلکہ وقت یہ

صورت حال لے کر ہمارے سامنے آیا تھا کہ ہر موقع ہاتھ سے جانے کے لیے اور ہر امکان ختم ہونے کے لیے اور ہر خطرہ واقع ہوجانے کے لیے پر تولے کھڑا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہمیں فوراً اور بروقت یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا ہم فی الحقیقت اس درجہ کمزور اور ناقابل کار ہیں کہ پیش آمدہ مواقع اور امکانات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اور اُن خطرات کو روکنے کے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے جو علانیہ آتے نظر آرہے ہیں؟ اور اگر حقیقۃً ہماری طاقت ایسی گئی گزری نہیں ہے بلکہ سوال صرف مزید تکمیل کی سعی کا ہے تو آیا ہمارے مقصد کے لیے یہ زیادہ مفید ہے کہ ہم اس تکمیل کی سعی میں لگے رہیں اور تمام مواقع کھودیں، سارے امکانات ضائع کردیں، ہر ممکن خطرے کو نازل ہوجانے دیں؟ یا یہ زیادہ بہتر ہے کہ جتنی اور جیسی کچھ طاقت بھی اللہ نے ہمیں بخشی ہے اُسے لیکر کام کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور تکمیل کی مساعی جہاں تک بھی ممکن ہو اس کے ساتھ ساتھ کرتے رہیں؟

پہلے سوال کا جواب اُس وقت ہمارے نزدیک قطعی نفی میں تھا، اور آج دس برس کے تجربات نے ثابت کردیا ہے کہ اسے نفی میں ہی ہونا چاہیئے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی اپنی طاقت اور اپنے ذرائع کے اعتبار سے ہرگز ایسی ناکارہ نہ تھی کہ اس وقت کے مواقع وامکانات سے فائدہ اٹھانے اور خطرات کے مقابلے میں اُٹھنے کے قابل ہی نہ ہوتی[۵]۔ ایسی رائے اپنے متعلق ہم قائم کرتے تو سخت نادان ہوتے۔ اور اس نادانی کا جو خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑتا اس کا پورا اندازہ ممکن ہے کہ آج آپ نہ کرسکیں، کیونکہ خدا کے فضل سے یہ نادانی ہم سے سرزد نہیں ہوئی، لیکن اس وقت کے حالات کا جو تجزیہ ابھی ابھی میں آپ کے سامنے پیش کرچکا ہوں اس سے آپ اس غلطی کے نتائج کا کچھ نہ کچھ تصور ضرور کرسکتے ہیں۔

دوسرے سوال کے بارے میں اُس وقت ہمارے درمیان دو رائیں نہ تھیں بلکہ پوری جماعت اس پر متفق اور مطمئن تھی کہ ہمیں اپنی موجودہ طاقت اور ذرائع ہی کو لے کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پیشقدمی کردینی چاہیئے ورنہ ہمارے مقصد کو اتنا بڑا نقصان پہنچ جائیگا کہ ہم مزید تیاری کی کسی کوشش سے اس کی تلافی نہ کرسکیں گے بلکہ شاید کچھ مدت کے بعد وہ گوشے بھی نہ پاسکیں گے جن میں یہ تیاری کا کام کیا جاسکے علاوہ بریں جماعت کے نزدیک اس وقت خود

۵۔ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ جماعت اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل صفحہ ۶۲۔۶۴

اِس تیاری کا راستہ بھی یہی تھا کہ ہم خدا کے بھروسے پر آگے بڑھیں اور میدانِ عمل میں اتر کر براہِ راست اپنے نصب العین کے لئے جدوجہد شروع کر دیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج اس باب میں ہمارے درمیان دو رائیں ہو جائیں اور کوئی شخص اُٹھ کر بے تکلف یہ کہہ دے کہ ہمیں اس وقت مزید تیاری ہی میں لگا رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ معاملہ اب محض ایک تاریخی حکم لگانے کا ہے، فیصلے کی گھڑی سامنے دیکھ کر رائے قائم کرنے کا نہیں ہے اور یہ بات اب کسی کے بس میں بھی نہیں ہے کہ ایسے تاریخی احکام لگانے والوں کی آنکھوں کے سامنے وہ نتائج لا کر رکھ دے جو ان کی اس رائے پر عمل کرنے کی صورت میں رونما ہوتے۔

طریقِ کار میں تغیر اور اس کی حقیقی نوعیت

اس طرح حالات کا جائزہ لینے اور اپنی طاقت اور ذرائع کا اندازہ کرنے کے بعد ہم نے اسلامی نظام کے مطالبے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دَور میں قدم رکھا۔ اس دَور میں ہم نے جو کچھ کیا، اس کی تفصیل اور تاریخ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے کیوں کہ وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ البتہ جس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے وُہ یہ ہے کہ وُہ کیا تغیر تھا جو اس دَور میں ہم نے اپنے سابق طریقِ کار میں کیا، اور اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی، اور نئے حالات میں اس خاص نوعیت کا تغیر کیوں مناسب ترین تھا۔

تقسیم سے پہلے جس طریقِ کار پر ہم کام کر رہے تھے اس کی عملی صورتوں سے قطع نظر، اصولاً وہ اِس نقشے پر مبنی تھا: ایک ایسی تحریک اُٹھائی جائے جو اپنے بنیادی نظریے، اپنے مزاج، اپنی قیادت اور اپنے کارکنوں کی سیرت کے اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلامی ہو۔ یہ تحریک ایک طرف معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی رُوح کو اسلام کے مطابق بدلنے کی کوشش کرے، دوسری طرف ایسے اصحابِ فکر تیار کرے جو نظامِ باطل کی نظری بنیادوں کو توڑنے اور نظامِ حق کی بنیاد پر نئی عمارت اُٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور تیسری طرف نظامِ باطل کے خلاف عملاً کشمکش برپا کر کے اسے پیچھے دھکیلنے اور خود آگے بڑھنے کی سعی کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ ان تین راستوں سے ایک ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے وُہ منزل آ پہنچے جب معاشرے کی بدلی ہوئی آب و ہوا میں نظامِ باطل کا چلنا مشکل ہو جائے، نظامِ حق کے لئے جگہ چھوڑ دینے پر وُہ مجبور ہو، اور اس نئے نظام کو سنبھالنے کے لئے موزوں آدمی بھی تیار

پائے جائیں [1]

اس طریقِ کار کے مطابق ہم اُس طرح کی ایک تحریک اُٹھا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ہمارے مقصد کے لیے مطلوب تھی۔ معاشرے کی ذہنیت بدلنے کے لیے کوششوں کا آغاز بھی ہم نے کر دیا تھا، لیکن متحدہ ہندوستان میں صرف مسلم معاشرے کی تبدیلی فیصلہ کن چیز نہ تھی، بلکہ آخری نتائج کا انحصار اس پر تھا کہ غیر مسلم معاشرے پر اسلامی اثرات ڈالنے میں ہم کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔ اصحابِ فکر کی تیاری کے لیے ہم نے دو راستوں سے کوشش شروع کر دی تھی۔ ایک یہ کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے طرزِ فکر کو تبدیل کر کے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تنقید و تعمیر کی راہ پر ڈالا جائے۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ رائج الوقت نظام کے تحت تعلیم پا رہے ہیں ان کے اندر اسلامی فکر پیدا کر دی جائے۔ تیسرا راستہ جو اس مقصد کے لیے ہم اختیار کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ خود اپنا ایک نظامِ تعلیم و تربیت قائم کریں، مگر اس میں ہم کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اب رہی نظامِ باطل سے عملاً کشمکش، تو جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، اس کے لیے کوئی موقع ہمیں اُس وقت حاصل نہ تھا، اس لیے ہم مناسب موقع کے انتظار میں تھے، اور اس کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔

تقسیم کے بعد اس اصولی طریقِ کار میں درحقیقت کوئی بنیادی تغیر نہیں کیا گیا۔ ہماری تحریک کی اساس وہی رہی جو پہلے تھی۔ معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی روح کو بدلنا اُسی طرح ہمارے پروگرام کا ایک لازمی جزو رہا جس طرح پہلے تھا۔ اصحابِ فکر کی تیاری کے لیے بھی ہم اُنہی دو راستوں سے کام کرتے رہے جن سے پہلے کام کر رہے تھے۔ اور نظامِ باطل کے خلاف کشمکش جس کا اب ہم نے آغاز کیا وہ بھی نئی چیز نہ تھی بلکہ پہلے سے ہمارے طریقِ کار میں شامل تھی۔ اب جس چیز کو تغیر کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ اُس طریقِ کار پر عمل درآمد کی شکل تبدیل کر دی۔ اس تبدیلی کی تھوڑی سی تشریح میں آپ کے سامنے کر دوں گا جس سے آپ اس کی صحیح نوعیت اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" ذیلی عنوان "اسلامی انقلاب کی سبیل"

پہلی تبدیلی ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں کی، کیونکہ اب ہم ایک ایسے ملک میں کام کر رہے تھے جس کی غالب آبادی، قریب قریب ۹۰ فی صدی، مسلمانوں پر مشتمل تھی اور جس میں نظامِ زندگی کے بننے اور بگڑنے کا انحصار مسلمانوں ہی کی عام خواہش پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں اپیل کا بعینہٖ وہ طریقہ موزوں نہ ہو سکتا تھا جو غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں اختیار کیا جا رہا تھا۔

دوسری تبدیلی ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں کی۔ پہلے ہم مواقع کے فقدان کی وجہ سے دعوت، توسیعِ نظامِ جماعت، اور اصلاحِ معاشرہ کا کام صرف چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب مواقع بہم پہنچتے ہی ہم نے یہ تینوں کام وسیع پیمانے پر کرنے شروع کر دیئے اور مطالبۂ نظامِ اسلامی کی جدوجہد کو ان کا وسیلہ بنایا۔ اس جدوجہد نے ہمارے لیے یہ راستہ کھول دیا کہ لاکھوں آدمیوں تک اپنی دعوت پہنچائیں، ان میں سے ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ رکن یا متفق یا ہمدرد و متاثر کی حیثیت سے وابستہ کرلیں، اور معاشرے میں اسلامی نظام کی حمایت اور اس کی طلب کا عام جذبہ پیدا کرتے چلے جائیں، جس کا لازمی نتیجہ غیر اسلامی قدروں کے مقابلے میں اسلامی قدروں کا فروغ ہے۔ لیکن اس تبدیلی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کر کے صرف اس دوسرے طریقے ہی پر اعتماد کر لیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابق طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہ میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ البتہ جن نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم کو تقسیم کے بعد اٹھنا پڑا تھا ان سے عہدہ برآ ہونا اُس مستحکم توسیع کے ذریعہ سے ممکن نہ تھا جو دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہو سکتی ہے، اور یہ بات صحیح بھی نہ تھی کہ بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل ہوئے تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظر انداز کر دیتے۔

تیسری تبدیلی ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار میں کی۔ پہلے جس اسکیم پر ہم کام کر رہے تھے اس میں نظامِ باطل کی کارفرما طاقتوں سے براہِ راست کشمکش کا مرحلہ بہت دیر میں آنا تھا، اور اس مرحلے میں بھی ہم کو آہستگی کے ساتھ بتدریج داخل ہونا تھا۔ خود ہماری جماعتی مشینری بھی اس سکیم کے لحاظ سے کشمکش کے تدریجی ارتقا ہی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ لیکن نئے حالات سے سابقہ پیش آتے ہی ہم نے دفعتہً جدوجہد کے مرحلے میں

قدم رکھ دیا اور یہ جدوجہد بھی آہستگی کے ساتھ بتدریج بڑھنے والی نہ تھی، بلکہ یکلخت ملک گیر ہو جانے والی اور مختلف محاذوں پر پھیل جانے والی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا، اور الحمدللہ کہ ہم اپنے اس اندازے میں غلط ثابت نہ ہوتے کہ ہماری جماعتی مشینری اس یکایک تبدیلی کو سہار لے جائے گی۔ در اصل وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اپنے مقصدِ عظیم کی خاطر ہم نے یہ ایک بڑا خطرہ محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر مول لیا تھا۔ اس میں اس امر کا پورا امکان تھا کہ ہمارا اندازہ غلط ثابت ہو اور یہ چھوٹی سی مشین جو ابھی پایۂ تکمیل کو بھی نہ پہنچی تھی، اتنے بڑے کام کا بار پڑ جانے پر کسی وقت بھی ٹوٹ پھوٹ جائے۔ لیکن جس خدا کے بھروسے پر ہم نے یہ خطرہ مول لیا تھا اس نے ہماری مدد فرمائی، اور ضائع ہونے کے بجائے محض اس کے فضل سے یہ اتنی ہی قوت اور وسعت پکڑتی چلی گئی جتنا اس پر کام کا بار بڑھتا چلا گیا۔

چوتھی اور بڑی اہم تبدیلی، جسے دراصل تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا زیادہ صحیح ہے، ہم نے اپنی پیشقدمی کے نقشے میں کی۔ اس کو میں تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا اس لیے صحیح سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس ایسی کوئی اسکیم پہلے سے بنی ہوئی نہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی، کہ نظامِ باطل کے خلاف ہماری کشمکش کا نقطۂ آغاز کیا ہوگا، پھر اس سے کشمکش کرتے ہوئے ہم کس راستے سے، یا کن کن راستوں سے اقامتِ حق کی جدوجہد میں پیش قدمی کریں گے اور اس پیش قدمی کے دوران میں مزاحم طاقتوں کو روکنے اور پیچھے ہٹانے کے لئے ہمیں کیا کچھ کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ بہرحال حالات پر منحصر تھا۔ کوئی بھی اس کے لیے پیشگی مفصل نقشہ نہ بنا سکتا تھا اور نہ تمام حالات میں ایسے کسی نقشے پر لگی بندھی جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ اگر ہم قبل تقسیم کے حالات میں ہوتے تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارا نقطۂ آغاز کیا ہوتا اور نقشۂ جنگ کیا بنتا۔ اگر ہم تقسیم کے بعد اُن حالات میں ہوتے جو آج بھارت میں ہیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ کشمکش کا مرحلہ دس سال بعد بھی آتا یا نہ آتا، اور آتا تو وہ کیسے شروع ہوتی۔ پاکستان قائم ہونے پر جو صورت حال رونما ہوئی اس کو دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ جس جماعت کا مقصد نظامِ کفر و فسق کی جگہ نظامِ دینِ حق، اور امامتِ فاجرہ کی جگہ امامتِ صالحہ کا قیام ہو اسے اپنے مقصد کے لیے ان حالات میں کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔ ہم نے وقت کے

باقی صفحہ ۱۱۴ پر